دل جس سے زندہ ہے

(مولانا ظفر علی خاںؒ کی نعتیہ تاب وتب)

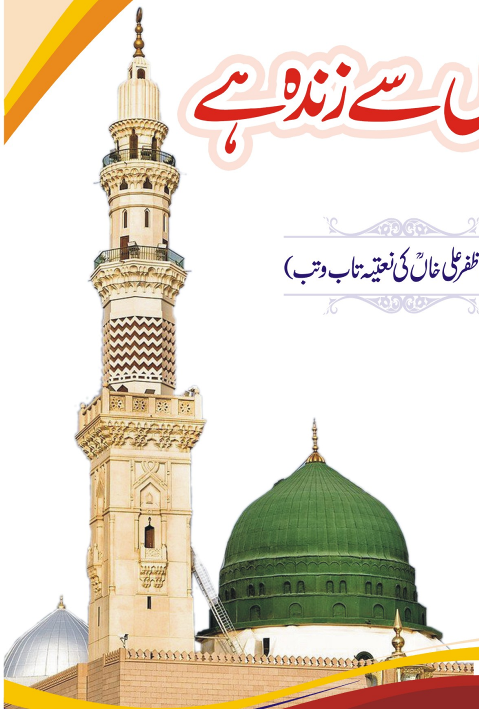

پروفیسر
محمد اقبال جاوید

رونقِ بزمِ دودۂ آدم، صلی اللہ علیہ وسلم
خواجۂ گیہاں، سرورِ عالم، صلی اللہ علیہ وسلم
جادہ شناسِ منزلِ وحدت، جلوہ نمائے نورِ حقیقت
ہادئ اکبر، مصلحِ اعظم، صلی اللہ علیہ وسلم

(مولانا ظفر علی خاںؒ)

دل جس سے زندہ ہے

(مولانا ظفر علی خاںؒ کی نعتیہ تاب وتب)

دل جس سے زندہ ہے، وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں، وہ دنیا تمھی تو ہو

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

پروفیسر
محمد اقبال جاوید

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں:

نام کتاب ...... دل جس سے زندہ ہے

(مولانا ظفر علی خاںؒ کی نعتیہ تاب وتب)

مرتب ...... پروفیسر محمد اقبال جاوید

کمپوزنگ ...... سجاد انو ویشنز، فرسٹ فلور دین پلازہ گوجرانوالافون: ۰۵۵۔۳۸۵۹۶۹۰

اشاعت ...... اپریل ۲۰۱۵ء

تعداد ...... پانچ سو

قیمت ...... ۱۰۰ روپے

ISBN: 978-969-8918-29-3

ناشر

نعت ریسرچ سنٹر

۳۰۶۔بی، بلاک نمبر ۱۴ گلستانِ جوہر، کراچی فون: ۰۳۳۳۔۲۴۵۷۵۷۵

بسم الله الرحمن الرحيم

O

دل جس سے زندہ ہے، وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں، وہ دنیا تمھی تو ہو

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

تہدیۂ نیاز، بہ حضورِ ناز

- اے وہ کہ جس کی یکتائی کا نقارہ اقصائے کائنات میں صبحِ آفرینش سے بج رہا ہے۔
- اے وہ کہ جس کے لیے صد ہزار ازل اور ابد ایک گریز پا لمحہ کا غبارِ نفس ہے۔
- اے وہ کہ جس نے انسان کو احسنِ تقویم کے نورانی سانچے میں ڈھال کر اپنی حکمتِ بالغہ اور صنعتِ کاملہ کے کرشمے اربابِ نظر کو دکھائے ہیں۔
- اے وہ کہ نیستی میں سے ہستی اور ہستی میں سے نیستی، ظلمت میں سے نور، نور میں سے ظلمت، زندگی میں سے موت، موت میں سے زندگی، عزت میں سے ذلت اور ذلت میں سے عزت پیدا کرنا جس کی شانِ خلاقی کا سرمدی مشغلہ ہے۔
- اے وہ کہ جس کی بے پایاں محبت نے اپنے برگزیدہ پیغمبروں کی معرفت انسانِ ضعیف البنیان کے قلبِ تاریک کو اپنی مشیت کی نورانی حقیقتوں سے رہ رہ کر جگمگایا ہے۔
- اے وہ کہ جس کی ناخدائی نے نوحؑ کی کشتی کو گردابِ بلا سے بچایا۔ ابراہیم علیہ السلام کے لیے نارِ نمرود کو گلزار بنایا، موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے چنگل سے چھڑایا، عیسیٰ علیہ السلام کو بیک جست اس تیرہ خاکدان سے چرخِ بریں پر پہنچایا اور محمد ﷺ کی عالم گیریوں کا پرچم کونین میں اڑایا۔
- اے وہ کہ ہمارے شہپرِ اندیشہ کی انتہائی اڑان سے بھی دُور لیکن بہ ایں ہمہ ہماری شہ رگ سے بھی نزدیک ہے۔
- اے وہ کہ جس نے فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي کی صلائے عام دے کر ہم سے اٹل وعدہ کیا ہے کہ اگر ہم اپنی پیشانی اس کی چوکھٹ پر رکھ دیں گے اور رو رو کر اس سے مرادیں مانگیں گے تو ہماری التجا ٹھکرائی نہ جائے گی۔

(مولانا ظفر علی خاںؒ)

خمستانِ ازل کا ساقی

پہنچتا ہے ہر اک مے کش کے آگے دورِ جام اس کا
کسی کو تشنہ لب رکھتا نہیں ہے لطفِ عام اس کا
گواہی دے رہی ہے اس کی یکتائی پہ ذات اُس کی
دوئی کے نقش سب جھوٹے ہیں، سچا ایک نام اس کا
ہر اک ذرّہ فضا کا داستاں اس کی سناتا ہے
ہر اک جھونکا ہوا کا، آ کے دیتا ہے پیام اس کا
میں اس کو کعبہ و بت خانہ میں کیوں ڈھونڈنے نکلوں
مرے ٹوٹے ہوئے دل ہی کے اندر ہے مقام اُس کا
سراپا معصیت میں ہوں، سراپا مغفرت وہ ہے
خطا کوشی روش میری، خطا پوشی ہے کام اس کا
ہوئی ختم اُس کی حجت اِس زمیں کے بسنے والوں پر
کہ پہنچایا ہے ان سب تک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کلام اس کا
بجھاتے ہی رہے پھونکوں سے کافر اس کو رہ رہ کر
مگر نور اپنی ساعت پر رہا ہو کر تمام اس کا

O

(مولانا ظفر علی خاںؒ)

مولانا ظفر علی خاںؒ
کی
نعتیہ تاب وتب

شخصیت کی تعمیر میں توارثی روایات کا عکس بھی ہوتا ہے اور گرد و پیش بکھری ہوئی سچائیوں کے اثرات بھی۔ بسا اوقات وقتی تقاضے بھی سمندِ شوق کے لیے مہمیز بن جایا کرتے ہیں۔ نتیجہ معلوم کہ ساز تڑپتے، نغمے بکھرتے، جذبات مچلتے اور وقت کے ایوان مہکتے چلے جاتے ہیں کہ زندگی دیپک بھی ہے اور ملھار بھی، آتش بھی ہے اور گلزار بھی۔

مولانا ظفر علی خان توارثی عظمتوں سے بھی بہرہ ور تھے اور ماحول بھی انھیں ایسا انقلاب آفرین ملا کہ اُن کی شخصیت نکھرتی چلی گئی اور وہ ''فلکِ کج رفتار کی قبائے زرنگار پر جگمگاتی ہوئی قندیلوں کو گواہ بنا کر'' جو محسوس کرتے رہے، علی الاعلان کہتے رہے، ہاتھ قلم بھی ہوتے رہے مگر وہ دورِ ستم پرور میں رُودادِ جنوں لکھتے رہے۔ وہ ایک عہد کے شعر و ادب اور سیاست و خطابت پر چھائے رہے۔ اُن کا قلم اُن کے لیے کبھی ڈھال کا کام دیتا تھا کبھی تلوار کا۔

قوتِ ایمان نے انھیں زندگی مستعار کے ہر سنگین مرحلے میں سر بلند رکھا۔ وہ فرنگی کے ظلم و استبداد سے ٹکرائے۔ انھوں نے خوابِ غفلت میں مدہوش ملتِ اسلامیہ کو جھنجوڑا، غیرت و حمیت کو بیدار کیا کہ وہ تب، عفت کی قبروں کا غازۂ شب تاب بن چکی تھی۔ انھوں نے اکڑی ہوئی گردنوں کو جھکنے پر مجبور کیا اور اُس دستارِ فضیلت کے بل کھولے جو رہنِ میخانہ ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے قلم کو سوزِ جاودانی اور اپنی تقریروں کو دریاؤں کی روانی دے کر حضور ﷺ کی ختم الرسلینی پر شب خون مارنے والوں کو غبار

معصیت بنا کر اڑا دیا۔ ظفر علی خاں نے اُس ماحول کو تازگی اور رعنائی دی جس میں شاخیں سر بریدہ اور کونپلیں دریدہ پیرہن تھیں اور اُس وقت ظلمتوں کو اجالا عطا کیا جب کہ آفتاب کی ہر کرن گریزاں تھی۔ وہ سراسر مثلِ خورشید تھے کہ ''اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے''۔ وہ میدانِ سیاست اور دُنیائے صحافت میں سیماب کی سی بے چینی اور برق کی سی تیزی لے کر ابھرے، اُن کے بارے میں حالؔی کا یہ اعتراف کچھ کم نہیں ہے۔ ؎

پھیلے وہ بہ شکلِ سیلِ آتش
دل میں تیرے جو شرر تھے پنہاں

وہ بے قراری کی اس کیفیت کے ساتھ استقامت کی دولت سے بھی بہرہ ور تھے۔ حق یہ ہے کہ جب شہرِ عشق میں جنوں کا قحط عروج پر تھا، خوف مسلط اور جبر کی حکمرانی تھی، حبس اس نوع کا تھا کہ لوگ لُو کی دُعا مانگتے تھے۔ زبانیں اظہار کو ترستی تھیں، لفظ لب پر آتے تھے مگر آواز نہیں بن سکتے تھے۔ ایسے میں ظفر علی خاں نے سوچ کو زبان دی۔ اظہار کو بے ساختہ پن بخشا اور کشتِ جنوں کی آبیاری اپنے لہو سے کی۔ ہر خوف سے بے خوف ہونے کی صلاحیت اور حق کے راستے میں پیش آنے والی ہر رکاوٹ کو پائے استحقار سے ٹھکرا دینے کی جرأت، اُن کے اندر صرف ایک ہی جذبے نے ابھاری تھی، اور وہ حُبِّ رسول ﷺ کا جذبہ تھا، وہ خوب سمجھتے تھے کہ ؎

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ طیبہ ﷺ کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدارِ طیبہ و بطحا ﷺ تمھی تو ہو

پھر گرم ہے بازارِ رسولِ عربی ﷺ
اور جل کے ہوئی راکھ حریفوں کی دکاں دیکھ

تمھارا قافلہ کچھ لٹ چکا اور کچھ ہے لٹنے کو
رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر بادِ صبا کر دے

ظفر علی خاں جانتے تھے کہ اِسی مسیحا کے پاس ہر دکھ کا علاج ہے، یہی ایک دیوار ہے جس کا سایہ ہر آبلہ پا کا خود انتظار کرتا ہے اور یہی وہ بارگاہ ہے جہاں پہنچ کر سرگرداں عقل کو منزل کا احساس نصیب ہوتا ہے۔ زندگی کی کوئی سی تلخی ہو، وقت کی کوئی سی کروٹ ہو، اور سیاست کی کوئی سی سنگینی ہو، ہر پھر کر، ان کی ہر سوچ، حبِ رسول ﷺ ہی سے شروع ہوتی اور اُسی پر ختم ہوتی تھی۔ وہ اسی محور کے گرد گھومتے تھے۔ اسی جذبۂ عالیہ سے بال و پر لے کر، اُن کا فکر انگڑائی لیتا، ان کا قلم لولوئے لالا ڈھالتا اور اُن کی زبان مہ و انجم بکھیرتی تھی۔ اور یوں لگتا تھا کہ ایک تختۂ چمن کھلا ہوا ہے اور رنگارنگ پھول شاخِ گفتار سے ٹوٹتے چلے جا رہے ہیں۔ اور یہ فیض تھا اس ذاتِ اقدس ﷺ سے محبت کا جس کے حُسن سے سورج ضیا لیتا اور جس کے نطق سے غنچے پھول بنتے ہیں

ے ہم بھلے ہیں یا برے ہیں، تیرے آخر ہیں غلام
ہم کو ہم چشموں میں اے آقا ﷺ، نہ ہونے دے ذلیل

پلایا ہے بھر بھر کے ساقی نے مجھ کو
خدا کے خمستاں سے جامِ محمد ﷺ

اور اسی جذبۂ حُبِ رسول ﷺ نے اُن کے رخِ کردار کو فقر و غنا کے اس غازے سے نوازا تھا کہ جس کا حاصل غیرت، سرمستی اور وقار ہے۔ وہ اِسی جذبے کے طفیل،

اس دنیا میں معزز رہے جب کہ اخروی سرخروئی ایسی ہی گُل رنگ زندگی کا ایک منطقی نتیجہ ہوا کرتی ہے ۔

مری مدح کرتی ہے ساری خدائی
ہوا ہوں میں جب سے ثنا خوانِ احمد ﷺ
ترانے مرے عرش پر گونجتے ہیں
میں ہوں عندلیبِ گلستانِ احمد ﷺ

سردارِ دوجہاں ﷺ کا بنا کر مجھے غلام
میرا بھی نام تا بہ ابد زندہ کر دیا

مرا منہ لیا چوم روح الامیںؑ نے
لیا میں نے جس وقت نامِ محمد ﷺ

گویا توصیفِ رسالت مآب ﷺ اُن کی حیاتِ مستعار کا مقصودِ حقیقی تھی اور باقی تحریریں اور تقریریں وقتی تقاضوں کا بدیہی ثمر تھیں ۔

خدا کی حمد، پیغمبر ﷺ کی نعت، اسلام کے قصے
مرے مضموں ہیں جب سے شعر کہنے کا شعور آیا

جب نبی ﷺ کی نعت میں مصروف ہوتا ہے قلم
کیسے کیسے خوشنما موتی پروتا ہے قلم

یہ اُن کے صاحبِ ایمان ہونے کی دلیل تھی کہ وہ عمر بھر، حق نگار اور حق شعار رہے اور اس حق شناسی کی پاداش میں وہ اکثر زنجیر وزنداں کی صعوبتوں تک بھی گئے۔

مگر کسی مقام پر بھی نہ ان کے پائے استقلال میں لغزش آئی اور نہ ان کے رخِ کردار کا غازہ کجلایا۔ اِسے بھی اِسی تعلقِ خاطر کا فیض سمجھتا ہوں کہ مولانا ظفر علی خاںؒ کی عظمت کا اعتراف وہ نابغہ بھی کرتے رہے جنھیں دیکھ کر خود عظمت کا معیار قائم کیا جاتا تھا۔ اعترافِ عظمت کی ایک جھلک دیکھیے:

سر سید احمد خاں: ان میں ایک روشن مستقبل کے آثار دیکھ رہا ہوں۔

محسن الملک: اس نوجوان میں بلا کی تیزی ہے۔

شبلی نعمانی: ظفر علی خاں کا نام اور کام محو ہونے کی چیز نہیں۔

داغ دہلوی: پنجاب نے ظفر علی خاں اور اقبال پیدا کر کے اپنے ماضی کی تلافی کر دی ہے۔

علامہ اقبال: مولانا ظفر علی خاں کا قلم مصطفیٰ کمال کی تلوار ہے۔

خواجہ حسن نظامی: ظفر علی خاں کی اردو فارس کے راستہ سے یہاں پہنچتی ہے۔ قیامت کے دن اپنی پر اثر نظموں اور نعتوں کے سبب بخشے جائیں گے۔

سید سلیمان ندوی: اردو ادب نے تین کامل الفن استاذ پیدا کیے۔ محمد رفیع سودا، اکبر الٰہ آبادی اور ظفر علی خاں۔

ابوالکلام آزاد: وہ اُن لوگوں میں سے ہیں جو ہمیشہ راہ و منزل سے بے نیاز ہو کر چلتے ہیں۔

شیخ عبدالقادر: مولانا ظفر علی خاں نے اردو ادب کو سینکڑوں ترکیبیں دی ہیں جو اُن کے بہار آفریں قلم کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔

شوکت علی: ظفر علی خاں نے جو قومی و ادبی معرکے سر کیے، اُن کا اعتراف ان کے دشمنوں کو بھی ہے۔

محمد علی جوہر: ظفر علی خاں صحافی سے زیادہ ادیب ہیں، اُن کے قلم میں جو تلخی

ہے وہ سیاست کی ہے، جو چاشنی ہے وہ ادب کی دین ہے۔

غلام رسول مہر: مولانا کی متنوع شخصیت مدتوں ہنگامہ خیز رہی۔

تاجور نجیب آبادی: یہ قہرمانِ ادب وصحافت اپنی ہنگامہ خیز شخصیت کے اعتبار سے آج اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

رشید احمد صدیقی: مولانا کے طنز میں نعرۂ رستاخیز ہے۔

مولانا صلاح الدین احمد: جب مستقبل کا کوئی انصاف پسند مؤرخ اس خطۂ ارض میں فرنگ کے زوال کی داستان لکھے گا تو ظفر علی خاں کے نام کو اس داستان کا عنوان بنائے گا۔

سید عبداللہ: مولانا اُن اکابرینِ ملت میں سے ہیں جو صدیوں کے وقفے سے عالمِ ہستی میں آتے ہیں۔

حمید نظامی: افسوس کہ اُن کی صحافت کے عین عالمِ شباب میں سیاست مولانا کو صحافت سے چھین کر لے گئی۔ یہ صحافت کا ایک ایسا نقصان تھا جس کی آج تک تلافی نہیں ہو سکی۔

جوش ملیح آبادی: اُن کے کلام میں حجاز کی روح بولتی ہے۔

شورش کاشمیری: مجھے یہ اعتراف کرتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے مدت العمر ان کے خوانِ نگارش کی خوشہ چینی کی ہے۔

مرزا محمد منور: مولانا ظفر علی خاں کی جنگ بھی خدا اور رسول ﷺ کی خاطر تھی اور صلح بھی۔

ظفر علی خاں فطرت کی طرف سے بے پناہ شعری، ادبی اور فکری صلاحیتیں لے کر آئے تھے، مزاج سیمابی تھا۔ جب کہ اُن کا عہد بھی سراپا اضطراب تھا۔ حالات تیزی کے ساتھ اپنا رخ، اپنی صورت اور اپنی کیفیت بدلتے رہے اور ہر لحظہ بدلتی ہوئی

صورتِ حالات کے ساتھ ساتھ ظفر علی خاں کی شاعری، صحافت اور خطابت بھی اضطراب واضطرار کی کیفیت سے دوچار رہی۔ اُسے ٹھہراؤ، سکون اور اطمینان کی وہ مثالی فضا نہ مل سکی جس کے لیے شعراء وادباء آرزومندرہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظفر علی خاں کی خداداد ادبی اور شعری صلاحیتیں، ہجو اور ہیجان کی نذر ہوتی رہیں اور وہ کوئی ادبی نوعیت کا آفاقی شاہکار تخلیق نہ کر سکے۔ اُن کی شاعرانہ ثروت اُن ہنگامی موضوعات کو صحافتی ضرورتوں کے تحت نکھارتی رہی جن کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔

اس مادی دور کی مادی دوڑ میں کسے فرصت ہے کہ ظفر علی خاں کی ہنگامی نظموں کے شاعرانہ کمال اور عالمانہ جمال سے حظ اٹھا سکے۔ نسلِ نوکوان کی سیاسی اور ہنگامی تخلیقات سے نہ کوئی دلچسپی ہے اور نہ ان کے نزدیک اُن کی کوئی قیمت۔ یہ پود اپنے ماضی اور اپنی تاریخ دونوں سے بے نیاز ہو چکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ظفر علی خاںؒ نے ایک عہد کی ذہنی آبیاری بھی کی اور سیاسی رہنمائی بھی۔ ایک دور کو راستہ بھی دکھایا، راستے کے پیچ وخم سے بھی آگاہ کیا اور منزل کی نشان دہی بھی کی۔ انھوں نے وقت کی لہروں کو تحریکوں کا رنگ وآہنگ دیا، ان تحریکوں کو چلایا بھی مگر سوچ کی مضطربانہ کیفیات نے تحریک کو کسی منطقی انجام تک پہنچانے سے قبل ہی کوئی اور موضوع کوئی اور میدان چن لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ظفر علی خاں کو کہنے والوں نے بیسویں صدی کے ادب اردو کا المیہ کہا ہے۔ یا ایک ایسی عظمت، جو وقتی دھندلکوں میں کھو کے رہ گئی..... مگر یہ فطرت کی دین تھی کہ وہ ان پر شور ہنگاموں میں بھی وہ ذہنی یکسوئی، فکری ارتکاز اور قلبی ٹھہراؤ پیدا کر لیتے تھے جو شعر گوئی اور خاص طور پر نعت گوئی کے لیے ضروری ہے۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کے الفاظ میں:

’’بیسویں صدی کی شعری روایت میں تغیر وتبدل مواد کے ساتھ

ساتھ ہیئت میں بھی ظاہر ہوا اور جملہ اصنافِ نظم ونثر عصری تقاضوں کو اپنے اندر جذب کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اس حوالے سے جدید نظم کے مختلف رویے ہمارے سامنے آئے، غزل نے چولا بدلا، مرثیے میں ندرتیں پیدا ہوئیں، قصیدے نے مختلف شکلوں میں اپنا اظہار کیا اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز صنفِ سخن یعنی نعت نے اپنے خدوخال متعین کرنا شروع کر دیئے۔ یہی وجہ ہے کہ نعت کے جس قدر رنگا رنگ، متنوع ذائقے آپ کو اس صدی میں ملیں گے، شاید اس سے قبل نہ ملے ہوں۔ اسی طرح نعت کے اہم شعراء بھی اسی زمانے میں منفرد حیثیت کے حامل نظر آئیں گے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس زمانے میں مثنوی، قصیدے اور غزل نے نعتیہ موضوعات ومضامین کو اپنے مزاج میں داخل کیا۔ آخر ایسا کیوں ہوا؟ اس کا بنیادی جواب تو یہی ہے کہ اس زمانے میں نعت کی صنف دوسری اصناف کی ہم دوش رہی اور اُردو ادب میں ظاہر ہونے والی تمام فکری وفنی تبدیلیوں کو اس صنف نے قبول کیا اور نعت گو شعراء نے انھیں نہایت سلیقے سے استعمال کیا۔ نعت کی صنف کو بااعتبار بنانے والے شعراء میں ایک اہم شاعر ظفر علی خاں بھی ہیں۔،،

مولانا کی سیاسی شاعری اپنے اندر خطیبانہ رنگ اور مبارزانہ آہنگ لیے ہوئے ہے۔ ایسی شاعری کا طنزیہ لب ولہجہ عموماً درشت، کاٹ دار اور مبالغہ آمیز ہوا کرتا ہے۔

مگر مولانا ظفر علی خاں کا قلم جب نعت کہتا ہے تو تراکیب کی ندرت اور اُسلوب کا بانکپن تو حسبِ معمول اپنے کمال کو چھوتا نظر آتا ہے مگر اُن کے طنّاز قلم کی کاٹ، عقیدت اور شیفتگی کے سانچے میں ڈھل کر شبنم کے مانند لطیف، برگِ گل کی طرح گداز اور موجِ صبا کی طرح سبک ہو جاتی ہے۔ ہر لفظ محبت و عقیدت کی انگشتری کا نگینہ بن کر جگمگاتا اور ہر خیال جذب و شوق کی فضاؤں میں انگڑائی لیتا محسوس ہوتا ہے۔ مولانا راسخ العقیدہ تھے۔ مقامِ رسالت ﷺ کی رفعتوں، عظمتوں اور نزاکتوں کا انھیں کماحقہٗ احساس تھا۔ اس لیے انھوں نے کوشش کی کہ کہیں بھی حکایت، شکایت نہ بنے۔ عقیدت کی بینائی بھی قائم رہے اور آبگینے کی نزاکت کو ٹھیس بھی نہ لگے کہ جب عقیدت، بصارت کھو دیتی ہے تو بدعت کی گمرہی اُسے وجہِ توہینِ رسالت بنا دیتی ہے۔ گمراہی کی پہچان یہ ہے کہ وہ بے ذوق بھی ہوا کرتی ہے اور کم نظر بھی۔ جب کہ توصیفِ رسالت ﷺ کے لیے قلم قلم، حرف حرف اور لفظ لفظ آگہی افروز احتیاط کی ضرورت ہے۔ یہاں تو سو بار سوچ کر، ایک بار قلم اٹھتا ہے اور پھر بھی توصیف کا حق ادا نہیں ہوتا۔ ظفر علی خاں کی نعت مبالغے سے دامن بچاتی اور واقعیت کا دامن تھام کر آگے بڑھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی نعتیں جدید شعراء کے لیے اعتدال کے سانچے میں ڈھلا ہوا ایک خوبصورت معیار ہیں۔ اُن کی ذاتی زندگی پاکیزہ، بے داغ اور بے لوث تھی۔ کوئی سی انگلی بھی اُن کی کسی بے اعتدالی کی طرف اشارہ نہیں کر پاتی۔ اُن کی فکر بھی راست رہی اور عمل بھی واضح۔ ایسے بے غبار کردار کا حامل انسان جب انسانِ کامل ﷺ کی مدحت کے لیے قلم اٹھائے گا تو اس کے بہکنے اور بھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حق یہ ہے کہ مولانا کی دیگر منظومات اپنی تمام تر شعری لطافتوں اور ادبی خوبیوں کے باوجود، نسلِ نو کے لیے گلدستۂ طاقِ نسیاں ہو چکی ہیں مگر ان کی نعتیں آج بھی فردوسِ گوش اور نشاطِ روح بنی ہوئی ہیں۔ ؎

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی ﷺ تو ہو

اس زمین میں کتنی ہی نعتیں کہی گئی ہیں کہ اگر صرف انھیں یک جا کیا جائے تو ایک دفتر مرتب ہو سکتا ہے مگر کوئی ایک نعت بھی، اس نعت کے تاثر و کیف کو نہیں چھو سکی۔ اس نعت کو تغزل کی خوبی نے بے پناہ تاثر دیا ہے۔ تغزّل، غزل کو نہیں بلکہ اُس کیف کو کہتے ہیں جو شعر میں دل آویزی کی صلاحیت ابھارتا اور اس میں تیرِ نیم کش کی کسک اور خلش پیدا کرتا ہے۔ نظم و نثر کو بھی تغزل ہی رعنائی دیتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں کی کم و بیش تمام نعتیں، غزل کی ہیئت میں ہیں اور تغزل کی کیف سامانیوں سے بہرہ ور۔ سیّد عبداللہ، اسی متغزلانہ سحر کو محسوس کرتے ہوئے مولانا کی نعت گوئی کو یوں خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں:

> ''ظفر علی خاں کی نعت ایک ایسے قلب کی آواز ہے جو یقیناً محبت سے آشنا ہے۔ نعت تو خیر محبت ہی کا ایک رنگ ہے۔ اُن کی عام شاعری کے لہجے اور اظہارات سے بھی اُن کے درد پسند دل کے راز ظاہر ہو رہے ہیں۔ نعت کا موضوع بڑا نازک موضوع ہے۔ مگر بہ صد استغفار و توبہ، میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ کوئی وہ شخص عشقِ رسول ﷺ کی شاعری نہیں کر سکتا جو محبت کے کرب و درد اور انہماک اور مرکزیت توجہ سے باخبر نہ ہو...... خیر جو کچھ بھی ہو، ظفر علی خاں کی نعتیہ شاعری بہ یک وقت محبت کی شاعری بھی ہے اور عقیدت کی شاعری بھی۔ یہ تو ظفر علی خاںؒ کا پاسِ ناموسِ عشق ہے کہ انھوں نے حبِّ رسول ﷺ کا دم بھرنے کے بعد اپنی دوسری محبتوں کو تذکرے کے لائق خیال نہیں کیا۔ ورنہ اُن کی شاعری محبت کے ہر پاکیزہ جذبے کی ترجمان بن سکتی تھی

اور میں ذاتی طور پر اُن کی نعت ''دل جس سے زندہ ہے......'' کو بھی غزل ہی کہوں گا، بہ شرطے کہ احباب غزل کو صرف ''گفتگوئے محبت باز ناں،، تک محدود نہ کریں۔''

سچ یہ ہے کہ ظفر علی خاں غزل کہتے تو اپنے دور کے بہت سے میر تقیوں کو پیچھے چھوڑ جاتے، انھوں نے سیاسی نظمیں کہیں کہ وہ اُن کی صحافتی زندگی کی ایک وقتی ضرورت تھیں۔ انھوں نے مناظرِ فطرت کو بھی موضوعِ شعر بنایا کہ فطرت کی دل آویزیوں سے ہر آنکھ عبرت و موعظت کے سامان لیا کرتی ہے اور قرآن مجید تو بار بار چلتی ہواؤں، اُمنڈتے بادلوں، بہتے دریاؤں، تیرتی کشتیوں، رواں دواں چشموں، پر ہیبت چٹانوں، جلال آفرین پہاڑوں، ابھرتے، ڈوبتے اور جگمگاتے ستاروں، سانس لیتی ہوئی صبحوں، اور شفق کے پیرہن میں مسکراتی ہوئی شاموں پر غور کرنے اور اُن سے قلب ونظر کو روشن تر رکھنے کا سبق دیتا ہے۔ یا پھر مولانا نے قومی اور ملّی نظمیں کہیں۔ فتنۂ مرزائیت کو بھی للکارا، یہ للکار بھی دراصل حبِ رسول ﷺ کا ایک خوبصورت ثمر ہے کہ ختمِ نبوت ایک بنیادی ستون ہے۔ اگر یہ لرزتا ہے تو دین کی پوری عمارت زمین بوس ہو جاتی ہے۔ انھوں نے اگر شانِ رسالت ﷺ پر شب خون مارنے والوں کو للکارا تو یہ اُن کا ایک دینی فریضہ تھا جسے انھوں نے جرأت اور استقامت کے ساتھ ادا کیا۔ اسی سرفروشانہ شاعری کا نتیجہ تھا کہ کچھ ہی سال بعد یہ فتنہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔ ختم نبوت کے تحفظ کی تاریخ مولانا ظفر علی خاں کے نام اور کام کا اعتراف کیے بغیر نہ آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ مکمل ہو سکتی ہے۔ ایک مرزائیت ہی نہیں بلکہ جس نے بھی حضور ﷺ کے خلاف کچھ کہا، ظفر علی خاں کے قلم نے اُس ناپاک گریبان سے الجھنا اپنا فرض سمجھا۔ انھوں نے عصری مسائل کا تذکرہ بھی نعت میں کیا اور نعت کو ناموسِ رسالت کے تحفظ کا بہترین ذریعہ بھی بنایا۔

جو مسلم ہے تو جاں ناموسِ ملت پر فدا کر دے
خدا کا فرض اور اس کے نبی ﷺ کا قرض ادا کر دے

ان نظموں میں سارقینِ نبوت کے بارے میں مولانا کے قلم کا طنزیہ لب ولہجہ، تلواروں سے کہیں زیادہ بے باک، شدید اور تیز ہے۔ میں مولانا کی ان نظموں کو بھی نعت ہی کہوں گا کہ یہ ناموسِ رسالت مآب ﷺ کے تحفظ کی خاطر کہی گئی ہیں۔ خود رسول اللہ ﷺ نے مخالفین کے گستاخانہ اور ہجویہ اشعار کا جواب دینے کے لیے صحابہ کرامؓ کو ترغیب دی تھی۔ حضرت حسانؓ بن ثابت کی شاعرانہ صلاحیتوں کا رُخ بھی اسی ترغیب نے موڑا تھا اور باقاعدہ نعت گوئی کا آغاز بھی اسی تشویق و ترغیب کا دل آویز نتیجہ ہے۔ مولانا کی نعت گوئی نے یہ ثابت کر دیا کہ زلف و عارض کی ہر مبالغہ آمیز مجازی داستان، رُخِ رسالت مآب ﷺ کے سامنے ہیچ ہے کہ حضور ﷺ کا چہرۂ زیبا، رُخِ جمالِ الٰہی کا آئینہ تھا اور آپ ﷺ کا اسوۂ حسنہ، کمالِ رحمت باری کی انتہا۔ جس آنکھ نے اس چہرے کو دیکھ لیا اور اُس کردار کو پالیا، اس کی نگاہ میں کوئی اور جچا ہی نہیں کہ آفتاب مل جائے تو ہر مہتاب کا بے نور ہو جانا، لازم ہوا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظفر علی خاں نے غزل کہنے کی جملہ صلاحیتوں کے باوجود ایک بھی رسمی غزل نہیں کہی.... نعت کی نزاکت، صداقت اور سعادت قلم کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ وہ نعت کہنے کے بعد کسی مجازی محبوب کی تعریف میں بھی گل کترنے کی کوشش کرے کہ محبت اپنی جگہ ہے مگر غیرت اس سے کہیں فزوں تر ہے۔ بہ قول سعدی ؎

ہر شاہدے کہ در نظر آمد بہ دل بری
در دل نیافت راہ کہ آں جا مکانِ تُست

حریمِ دل میں، کعبے کا کعبہ آجائے تو وہاں بتوں کا گزر کیسے ہوسکتا ہے۔ اگر یہ پاکیزگی، دل کے خلوت خانے کی تقدیر نہیں بنتی تو قلم کو نعت کہنے سے روک لینا چاہیے

اور جب تک نیشِ عشق، گوارا ہو کر وجہِ کیف نہ بن جائے، خود بھی رک جانا چاہیے، کیوں کہ حق کے ساتھ مجاز کو لے کر چلنا، منافقانہ نوعیت کا شعری تلعب ہے۔ نعت غیرت مندانہ اخلاص کی طلب گار ہے۔ اس کے لیے دل کو ماسوا کی ہر محبت سے پاک ہونا چاہیے۔ اُسے اول و آخر خالی ہونا چاہیے۔ تبھی وہ کسی کا خلوت خانہ بنے گا۔ ظفر علی خاں کی نعت گوئی ان کے کمالِ ایمان کی دلیل ہے کہ انھوں نے حضور ﷺ ہی کی محبت کو دل کی دولت، قلم کی متاع اور اظہار کا سرمایہ بنایا اور اس نعمت سے ٹکرانے والی ہر دل بستگی کو حقارت کے پاؤں کی ٹھوکر سے اڑا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ بہترین شعری صلاحیتوں کے باوجود انھوں نے روایتی غزل نہیں کہی بلکہ غزل کو فی الواقع تقدس کی معراج عطا کی۔ تلاش کا جذبہ دونوں جگہ ہے، مگر مقصود و مطلوب کے فرق نے، چیونٹی کو خاکِ رہ میں بھٹکنے پر اور شاہین کو آسمان کی رفعتوں کو بھی خاطر میں نہ لانے پر مجبور کر رکھا ہے۔ مقصد کی عظمت، سعی و کاوش کو جمال کا کمال عطا کیا کرتی ہے۔ آغا شورش کاشمیری کے الفاظ میں:

> ”حضور سرورِ کائنات ﷺ سے ظفر علی خاں کو جو عشق تھا، وہ اُن کی شاعری کی جان ہے۔ اُن کی صنفِ شاعری، عشقِ رسول ﷺ سے بھری پڑی ہے۔ جو عقیدت انھیں اس نام اور اس ذات ﷺ سے رہی، اُن کی نعتیں اسی کا والہانہ اظہار ہیں۔ ایسی بے داغ نعتیں شاذ ہی ملتی ہیں۔ خدائے لایزال نے جو کچھ حضور ﷺ کے بارے میں کہا، قرآن و حدیث کے اوراق سیرتِ طیبہ کا جو نقش پیش کرتے ہیں، مولانا کی نعتیں ہو بہ ہو اس کی تصویر ہیں۔“

پروفیسر غلام حسین ذوالفقار کہتے ہیں:

”ظفر علی خاںؒ کی تخلیقی صلاحیتیں اُن کی نعتیہ شاعری میں اپنی

ساری جمالی اور جلالی خصوصیات کے ساتھ بروئے کار آتی ہیں۔
اُن کی شاعری کا یہ حصہ ہنگاموں اور اجتماعوں سے الگ اُن کے خلوت خانۂ دل کا ترجمان ہے۔ یہاں جذبوں اور تخیل کے سہارے وہ اچھوتی اور لطیف فضاؤں میں سرگرمِ سیر رہتے ہیں۔
اظہار و بیان میں اُردو فارسی کی خوش آہنگ ترکیبیں، جذبے اور احساس کے مطابق سبک، شیریں اور پُرشکوہ الفاظ اپنے اپنے موقعوں پر آتے ہیں۔ اُن کی نعتیہ شاعری معنیٔ بلند اور الفاظِ خوش کے امتزاج سے صورت پذیر ہوتی ہے۔،،

غزل کی ہیئت میں کہی جانے والی، مولانا کی طویل نعتیہ منظومات اس قدر مرصع، رواں اور شگفتہ ہیں کہ یوں لگتا ہے جیسے جذب و شوق اور فکر و نظر کا ایک پاکیزہ سمندر ہے جو بے روک ٹوک بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اُن کا قلم نہ سنگلاخ زمین کی پروا کرتا ہے اور نہ اُسلوب و ادا کے اعتبار سے کہیں عجز اور ژولیدگی کا شکار ہوتا ہے وہ فنی اعتبار سے ہر مقام پر کانٹوں اور کنکروں کو گل و گلزار بناتا چلا جاتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کا سیاسی، دینی اور معاشی انحطاط، مولانا کے دردمند قلم کی نوک پر لو دیتا محسوس ہوتا ہے۔ وہ حبِ رسول ﷺ کے والہانہ جذبے میں ہر دکھ کا علاج پاتے ہیں۔ دردمندی اور دل سوزی کا یہی وہ شاعرانہ پیرایہ ہے جس نے حالی کے بعد بہ طور ایک مقصدی نعت گو، مولانا کے مقام کو ہر نعت گو سے اونچا کر دیا ہے۔ حالیؔ، مسلمانوں کے حال زار پر روتے، ہچکیاں لیتے اور آہیں بھرتے ہیں۔ محسن کاکورویؔ، ہندی لَے میں حجازی گیت گاتے چلے جاتے ہیں۔ جس طرح قدیم عرب شاعر، نعتیہ قصائد کی تشبیب میں مقامی تاریخی اور رومانی آثار کو بنیاد بنا کر بات شروع کرتے اور اظہارِ مدعا کے لیے کوئی نہ کوئی تقریب چاہتے تھے، اسی طرح محسن کاکورویؔ کے نعتیہ قصائد کی تشبیب بھی اپنے

اندر ایسا مقامی رنگ لیے ہوئے ہے جو صنائع بدائع کے شاعرانہ حسن سے آراستہ ہے۔
شہیدیؔ کی نعتیہ نظمیں اُن کے سوزِ دل اور ندرتِ اظہار کا ایک دل آویز شاہکار ہیں۔
اقبالؔ نے باقاعدہ نعت نہیں کہی۔ اُن کا قلم چلتے چلتے، نعتیہ ستارے اُبھارتا چلا جاتا ہے اور اگر سیاق و سباق میں جگمگاتے ہوئے ان نعتیہ جواہرات کو الگ کیا جائے تو اُن کے کلام کا بیشتر حصہ نعت ہی سے پھوٹنے، پھلنے اور پھولنے والی کیفیات پر مشتمل نظر آئے گا۔ اسی تناظر میں، ظفر علی خاں اس نوع سے منفرد ہیں کہ انھوں نے اگر بہ طور صنفِ سخن نعت کو اظہار کی رعنائی دی تو دوسری طرف ہنگامی اور سیاسی نظموں کے انبار بھی لگائے۔ وہ طبیعت کی موزونیت اور بدیہہ گوئی کی منہ زور شاعرانہ صلاحیتوں سے بے بس ہو کر، حقّے کے ہر کش کو شعر بناتے رہے۔ اُن کی نگاہ کا ہر زاویہ شعر ہی کا کوئی نہ کوئی دل آویز رخ ہوتا تھا۔ اُن کے قلم کی ہر جنبش کسی نہ کسی شاعرانہ حسن ہی کی آئینہ دار ہوتی تھی، اُن کا ہر جملہ ادبِ لطیف کے سانچے میں ڈھل کر سحرِ حلال ہو جایا کرتا تھا اور اُن کے خامۂ عنبر شمامہ کی ہلکی سی اُڑان، آج کی نظمِ معریٰ، نظم آزاد اور نثری نظم سے کہیں دل آویز اور دل نشین ہوا کرتی تھی۔ حق یہ ہے کہ جذبے کی حدت اور خیال کی رفعت نے اُن کی نثر کو بھی تغزل کا جمالیاتی کیف دے دیا تھا۔ وہ صحافت کے شہسوار، خطابت کے مردِ میدان، جذب و جنوں کے پاس دار اور دریدہ دامنوں کی آبرو تھے۔ اُن کی شاعری اپنے اندر حدی کے سوز سے زیادہ رجز کی للکار لیے ہوئے تھی۔ وہ سیاست کے میدان میں ایک سیل تندرو تھے۔ مگر نعت کی دنیا میں، یہی سیل بے پناہ، سمٹ کر، جوئے نغمہ خواں بن جاتا تھا۔ اُن کی نعت ادب اور محبت کے قرینوں سے ہم آہنگ ہو کر، اعجاز و ایجاز کی بلاغتوں تک پہنچ جاتی ہے۔ وہ اس اعتبار سے معتبر ہیں کہ انھوں نے اپنے دور کی دینی بے مائیگی، سیاسی کج روی اور فکری ژولیدگی کو نعت کے ذریعے سلجھانے اور سنوارنے کی شعوری کوشش کی۔ انھوں نے حضور ﷺ ہی کے حوالے سے وقت کی ہر

گمراہی کو ذوقِ سلیم عطا کرنے کی مومنانہ اور مجاہدانہ سعی کی۔آج ہر قلم نعت کہنے کی تمنا کر رہا ہے بلکہ بعض قلم تو مجبوراً نعت گوئی کی دوڑ میں شریک ہونے کی کوشش میں اپنی چال بھی بھول رہے ہیں۔گو ماضی قریب میں نعت نہ کوئی مستقل صنفِ سخن تھی اور نہ ''دانش ورنوعیت کے شاعر'' نعت گوئی اپناتے تھے بلکہ وہ نعت گوئی کو رجعتِ قہقری ہی کہا کرتے تھے جب کہ ماضی قریب میں ظفر علی خاں کو یہ شرف حاصل ہے کہ انھوں نے نعت کو ایک باقاعدہ صنفِ سخن کی حیثیت بھی دی اور غمِ دوراں کو غمِ جاناں میں ضم کرنے کی حسین روایت کا آغاز بھی کیا۔جناب مختار مسعود کے الفاظ میں:

''ظفر علی خاں کی شاعری کا دوسرا رُخ بھی ہے۔پہاڑوں میں بہنے والی سرکش ندی جب میدان میں داخل ہوتی ہے تو ایک پاٹ دار اور نرم رو دریا بن جاتی ہے۔اس دریا سے کھیت سیراب اور کشتِ دل ہری ہوتی ہے۔ظفر علی خاں کی شاعری کا یہ رُخ نعت کے میدان میں نظر آتا ہے۔ظفر علی خاں مجموعۂ اضداد تھے اور اُن کی نعتیہ شاعری اُن کی سیاسی شاعری کی ضد ہے۔وہاں ہجو، طعن اور پھبتی ہے، یہاں جذب و کیف اور مستی ہے۔اُدھر دشمن اُن سے پناہ مانگتا ہے اور اِدھر یہ دامن دوست میں پناہ لیتے ہیں۔ایک طرف آورد کا زور شور ہے اور دوسری جانب بس آمد ہی آمد۔نعت گوئی میں ظفر علی خاں اس درجہ کمال تک پہنچے جو ان سے بہتر شاعروں کو نصیب نہ ہوا۔دراصل نعت کے لیے کمالِ سخن وری سے زیادہ کمالِ جنوں کی ضرورت ہے، اور ظفر علی خاں کے پاس وارفتگی کا بڑا وافر سرمایہ تھا.....ظفر علی خاں عشقِ رسول ﷺ میں اُس مقام پر پہنچ چکے تھے جہاں عاشقِ رسول ﷺ کو یہ کہنے کا

حق پہنچتا ہے۔ ؎

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو'

مولانا کی نعت سرائی میں جنوں کی پرشکوہ کیف سامانیاں منتہائے کمال پر پہنچ کر قاری کے دل کے دروازوں پر دستک دیتی ہیں۔ گویا یہ نعتیں حسنِ کلام اور حسنِ ارادت کی ایک ایسی کہکشاں ہیں کہ اہلِ نظر آج بھی ان سے ذوق وشوق سمیٹ رہے ہیں اور سمیٹتے رہیں گے کہ ذکرِ رسول ﷺ ہی سے ہر دور کسبِ ضیا کرتا رہا اور کرتا رہے گا۔ ؎

کس طرح ذروں کو ملتی ہے ضیا
تابشِ خورشید سے ٹکرا کے دیکھ

حقیقت یہ ہے کہ دلوں کو کیف، ذہنوں کو جلا، شوق کو نوا، غنچوں کو چٹک، دھندلکوں کو اجالا اور ذروں کو رخشندگی، اِسی تابشِ خورشید سے ملتی ہے جب کہ یہ طے ہے کہ ہر دور کی ہر صداقت آفرین طلب کو اِسی بارگاہِ صدق اظہار سے رجوع کرنا ہو گا۔ اقبالؔ نے کہا تھا۔ ؎

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آں کہ از خاکش بروید آرزو
یا زِ نورِ مصطفیٰ ﷺ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ ﷺ است

قاری محمد طیب کے الفاظ میں "آفتابِ نبوت، بشری ازل سے چمکا اور کائناتی ابد تک چمکتا رہے گا اور اس دوران میں نہ اُس نور کا کسی وقت انقطاع ہوا اور نہ ہو گا۔ کہیں بلاواسطہ، کہیں بالواسطہ، روشنی اُسی کی کام کرتی رہی اور کرتی رہے گی۔"

اور نورِ مصطفیٰ ﷺ کی یہی ہمہ گیریت ہے جس نے ظفر علی خاں کی نعتوں کو آفاقی

تاب وتب عطا کر دی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ، اُن میں کہنگی پیدا نہیں ہوئی بلکہ ہر لحظہ ایک نئی تازگی محسوس ہوتی ہے اور ہر لحہ نئی شان اور نئی آن نظر آتی ہے۔
مولانا حنیف ندوی کے الفاظ میں:

''مدحِ رسول ﷺ مولانا کے جذبات و احساس کا نہایت ہی نازک گوشہ ہے۔ جب توجہ اس طرف مبذول ہوتی ہے تو پھر نہ پوچھیے کہ عقیدت و نیاز مندی کیوں کر سمٹ کر زندۂ جاوید نظم کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔''

آج کی نعت، خود کو ماضی کی نعت کے مقابلے میں اس لیے منفرد سمجھتی ہے کہ اس میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ آج کا نعت گو، ذات کے ساتھ کائنات لے کر چلتا ہے۔ وہ صرف عارض ورخسار کی دل ربا کیفیات کا اظہار نہیں کرتا بلکہ ذکرِ رسول ﷺ سے وہ توانائی اور وہ استقامت حاصل کرتا ہے جو حق کے لیے سر کٹانے، ہر دور کی ہر کربلا میں سرفروشانہ انداز میں در آنے اور بازارِ وفا میں سب کچھ لٹا کر، متاعِ دل و جاں خریدنے کو حیاتِ مستعار کی آرزوئے وحید سمجھتا ہے اور عمل کی دنیا میں اپنے لفظوں کی آبرو کو قائم رکھتا ہے۔ خود ظفر علی خاں کی اپنی زندگی جرأتِ اظہار اور بلندیٔ کردار کی ایک خوب صورت مثال ہے۔ حق کے لیے ہر مصیبت کو سینے سے لگا لینا اور زنجیر و زنداں کی سنگینیوں کو بھی خندہ روئی سے برداشت کر لینا، صرف اُسی کا نشانِ امتیاز ہو سکتا ہے جسے خدا کے خوف نے ہر خوف سے بے خوف کر دیا ہو۔
ظفر علی خاں کے یہ شعر اُن کی سرفروشی کا واضح ثبوت ہیں ؎

یہ ہے پہچان خاصانِ خدا کی ہر زمانے میں
کہ خوش ہو کر خدا ان کو گرفتارِ بلا کر دے

پیمبر ﷺ کی شفاعت پر مری اس عرض کا حق ہے
کہ آقا ﷺ تیری خاطر میں نے چکی جیل میں پیسی

جب انسان اس یقین کو پالیتا ہے کہ ہر آنے والی بلا، اُسے رضائے محبوب کے قریب تر لے جا رہی ہے تو پھر موت، زندگی کی تمہید بن جاتی ہے اور یوں رہِ محبوب میں لی جانے والی ہر سانس، عبادت کا حسن، اُٹھنے والا ہر قدم استقامت کی تاریخ اور بہنے والے لہو کی ہر بوند، شہادت کی نوید ہو جاتی ہے۔ ظفر علی خاں نے اس باب میں مومنانہ استقامت، سیرتِ رسول ﷺ سے حاصل کی......اُس وجودِ احسن و اکمل (ﷺ) کے روز و شب سے، جس نے ہماری رہنمائی کے لیے، حق کی خاطر، مکہ کی گلیوں میں توہین و استہزا کو برداشت کیا۔ طائف کی وادیوں میں خود کو لہو لہان کرا لیا۔ طریقِ ہجرت میں غارِ ثور کو اس لیے شرفِ میزبانی بخشا کہ اگر اُمت کے افراد پر ایسا وقت آجائے تو اپنی حفاظت ضروری سمجھی جائے۔ ورنہ پہاڑ باہم مل کر ''کافر وادیوں،، کو ملیامیٹ کر سکتے تھے، ہجرت کے لیے نرغۂ کفار سے صاف نکل آنے والی شخصیت کی متعاقب ہر آنکھ نابینا ہو سکتی تھی، ہر گھوڑا ریت میں دھنس کر اپنے ہر سوار کو منہ کے بل گرا سکتا تھا۔ مگر سیرتِ رسول ﷺ کے یہ تمام اوراق، ہماری رہ نمائی کے لیے تھے۔ بہ طور ایک انسان، ان کا ہر عمل، ہماری زندگی کی ظلمتوں کو اجالنے کے لیے تھا۔ طائف کے بازار سے لے کر کربلا کے ریگزار تک، حضور ﷺ کے نقوشِ پا، اس لیے لَو دے رہے ہیں کہ امت قیامت تک بھکنے اور بھٹکنے نہ پائے اور باطل کے مقابلے میں استقامت اس کا شعار رہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے نعت میں فضائل و اوصافِ رسالت مآب ﷺ کو بھی بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اسوۂ حسنہ کو زندگی کی تعمیر و تنویر کے لیے ایک بہترین نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کے الفاظ میں:

''جہاں مولانا کا نعتیہ کلام ادبی خوبیوں سے مالا مال ہے وہاں

اس کی عملی اور عوامی افادیت بھی ظاہر ہے۔ اس قسم کی شاعری نے ملک کے طول وعرض میں بالکل مختلف رنگ جمایا اور زندگی میں ایسی حرکت پیدا کی جس نے فکر ونظر کے رجحانات میں ایک تعمیری انقلاب برپا کیا۔ اب لوگ حضورِ پُر نور ﷺ کی زندگی کو زندگی سمجھ کر دیکھنے لگے۔ عالمِ قدس کی رونق نہیں بلکہ عالمِ امکان کا حاصل، زندگی کا مدعا اور محفلِ ہستی کی جانِ جاں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا ظفر علی خاں کی نعت گوئی کا اصلاحی اور مقصدی رنگ فقط حبِ رسول ﷺ کی سرمستی کا اظہار نہیں۔ یوں کلام میں جذب، کیف ومستی اور شوق کی شدت کا یہ عالم ہے کہ گل محمدی کا یہ فدائی اس گلستان کے کانٹوں سے بھی پیمانِ محبت باندھ کر انتہائی جذبۂ سرفروشی سے سرشار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن مقصدی نظر رکھنے کی بنا پر یہ جذبہ بے مقصد نہیں ہے۔ وہ جمالِ محمدی ﷺ کا فریفتہ بن کر اسوۂ محمدی ﷺ کی تجلیوں کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ وہ صفاتِ محمدی ﷺ میں زندگی کی تعمیر کے سامان کا متلاشی ہے اس کے نزدیک محمد (ﷺ) کا نام ہر عقدہ کشائی کے لیے اسمِ اعظم کا حکم رکھتا ہے۔''

مولانا کا یہ کہنا درست ہے کہ جب سے انھیں شعورِ شعر گوئی نصیب ہوا ہے، حمد ونعت اور تاریخ اسلام کے درخشندہ واقعات ان کے محبوب موضوع ہیں۔ انھوں نے سیاسی اور ہنگامی موضوعات پر بہت کچھ لکھا ہے مگر ان کے طبعی رجحان کو جہاں اور جب موقع ملا، حمد ونعت کا کوئی نہ کوئی پہلو نکل ہی آیا۔ ۲ نومبر ۱۹۱۷ء کو علامہ اقبالؒ کے ایک کبوتر کو (علامہ کو اچھی نسل کے کبوتر رکھنے اور پالنے کا شوق تھا) بلی نے کھا لیا۔

علامہ کی مغموم طبیعت کو بہلانے کے لیے مولانا نے ۲۲ نومبر ۱۹۱ے کو یہ نظم لکھ کر علامہ کو بھیجی۔ دیکھیے، موضوع سراسر وقتی ہے مگر مولانا کی طبعِ رسا نے حمد و نعت کے خوبصورت امتزاج سے اسے کیسے آفاقیت عطا کی ہے۔

رحمت ہو تیری جان پر اے مرغِ نامہ بر
آیا تھا اڑ کے زروۂ بامِ حرم سے تو
اندازِ جبرئیل تھا تیری اڑان میں
کرتا نہ کیوں حدوث کو پیدا قِدم سے تو
زمزم میں تر ہوئی تری منقارِ نغمہ ریز
کرتا رہا عرب کو نمایاں عجم سے تو
ہم کو دیا پیام الف۔لام۔میم کا
ناآشنا نہ تھا رہ و رسمِ الم سے تو
نفرت ہی آشیانۂ ہستی سے تھی تو کیوں؟
آیا اتر کے طارمِ کاخِ عدم سے تو
تجھ پر ابوہریرہؓ بھی قربان ہوں کہ تھا
وابستگانِ دامنِ شاہِ امم ﷺ سے تو
شاید انھی کی راہ میں تو ہو گیا نثار
گر بچ سکا نہ گربہ کی مشقِ ستم سے تو

مولانا شملے تشریف لے گئے۔ وہاں ایک دوست مولانا غلام محمد ندوی کے عقدِ ثالث کا دعوت نامہ ملتا ہے تو بے ساختہ اس دعوت نامے کی پشت پر ارتجالاً نعتیہ انداز میں یوں تبریک و تہنیت لکھ جاتے ہیں ۔

زمانہ میں چمکا ہے نامِ محمد ﷺ
ہوئی روکشِ صبح، شامِ محمد ﷺ
نہ پہنچے وہاں جبرئیلِ امینؑ بھی
بلند اس قدر ہے مقامِ محمد ﷺ
مرا منہ لیا چوم روح الامینؑ نے
لیا میں نے جس وقت نامِ محمد ﷺ
پلایا ہے بھر بھر کے ساقی نے مجھ کو
خدا کے خمستاں سے جامِ محمد ﷺ
فقط دو حقائق پہ دنیا ہے قائم
بقائے خدا و دوامِ محمد ﷺ
یہ مجلس جہاں شور ہے **وانکحوا** کا
ہمیں دے رہی ہے پیامِ محمد ﷺ
جواں دل ہیں، اس واسطے کر رہے ہیں
بڑھاپے میں شادی غلامِ محمد
ہے مثنیٰ سے آئی ثلاثہ کی نوبت
کہ ان کو یہ ہے اذنِ عامِ محمد ﷺ

۱۹۳۳ء میں مولانا برما جاتے ہیں۔ میمیو نامی شہر میں کچھ قیام کے بعد بہ وقتِ رخصت، احباب کے اصرار پر فی البدیہہ کہتے ہیں۔ ؎

مجھ سے کہ آپ کا ہوں میں ادنیٰ تریں غلام
سن لے پیامِ خواجۂ کونین ﷺ، میمیو

خمخانۂ الست ابھی تک ہے جوش میں
پینی ہے گر شراب اِسی خُم خانہ سے پیو
اسلام ہی وہ رستہ ہے سیدھا کہیں جسے
اس راہ میں مرو اور اسی راہ میں جیو
ہے تار تار ملتِ بیضا کا پیرہن
اس پیرہن کو سوزنِ ایثار سے سیو
مردوں ہی کے لیے نہیں علم و عمل کی قید
تم پر بھی فرض ہے یہ برابر کا بیبیو

اگر کوئی شعر لوگوں میں اس قدر مقبول ہو جائے کہ زبان زدِ عام ہو کر کم و بیش ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر لے تو اس کی وجہ طرفگیِ خیال کے ساتھ ساتھ شگفتگیِ بیان بھی ہوتی ہے مگر جب نعت کے کسی شعر کو قبولِ عام کا شرف مل جائے تو سمجھیے کہ گدازِ فکر اور رنگینیٔ ادا کے ساتھ ساتھ وہ شعر بارگاہِ ناز میں بھی باریابی پا چکا ہے۔ مولانا کی وہ نعت جس کی ردیف ''تمھی تو ہو،، ہے۔ اسی نوع کی مقبول نعت ہے۔ اسی طرح وہ نعت جس کا پہلا شعر ہے ''وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں،، اپنی اولین اشاعت (یہ نعت پہلی بار پنجاب ریویو، اگست ۱۹۱۰ء اور نظام المشائخ میں چھپی تھی) سے لے کر اب تک، قارئین میں کیف و سرور کی ایک دنیا بانٹتی چلی جا رہی ہے۔ اِسی نعت کے بارے میں مولانا صلاح الدین احمد نے لکھا تھا کہ ''آج بھی اس کے رقص آور مصرعے برگ ہائے گُلِ تر کے مانند معنبر و معطر ہیں۔'' اور پروفیسر غلام حسین ذوالفقار کے الفاظ میں ''اس نعت کی بہ دولت اُردو زبان کو بھی حیاتِ جاوداں مل گئی ہے،،۔ حق یہ ہے کہ حالی نے دھیمے اور پرتاثیر لہجے میں غمِ دوراں کو رسولِ پاک ﷺ کے حضور میں پیش کیا۔ ظفر علی خاں نے خطابت کے پرشکوہ لہجے اور اسلوب

وادا کے ادیبانہ رنگ کے ساتھ، حالی ہی کی روایت کو آگے بڑھایا اور یہی روایت دورِ حاضر کی نعت گوئی کے لیے بہترین اساس ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر شبیہ الحسن کا درج ذیل اقتباس احقر کے اسی خیال کا موید ہے:

''۱۸۵۷ء کے بعد تمام ادب کو مقصدیت اور افادیت کی ترازو میں تولا جانے لگا اور ادب کو فائدہ مند اور مقصدی بنانے کا رُجحان پیدا ہوا۔ نعت گوئی بھی اس ہنگامے کی زد میں آئی اور اس صنف کو بھی ذہنی اور فکری قبلہ درست کرنے کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اس طرح نعت میں بھی ایک مقصدی رَوسرایت کر گئی۔ جس شخص نے سب سے پہلے اس صنف میں باطنی اور خارجی دونوں حوالوں سے تبدیلیاں کیں، وہ الطاف حسین حالی تھے۔ حالی نے نعتیہ اشعار کو سماج کی تبدیلی کے لیے بہ طور ہتھیار استعمال کیا۔ انھوں نے اُمتِ مسلمہ کے تمام مسائل کا حل اتباعِ رسول ﷺ میں دریافت کیا اور نعت نگاری کو مسلمانوں کے اعمال درست کرنے کا وسیلہ قرار دیا۔ اس حوالے سے ان کے ''مسدس مدو جزر اسلام،، کی مثال ہی کافی ہے۔ اقبال نے حالی کے اس بنیادی نکتے کو سمجھ کر اس کی مزید توضیح کی۔ یہی سبب ہے کہ اقبال کے ہاں خودی کی منزلوں سے لے کر مردِ کامل بننے تک تمام تر معاملاتِ اتباعِ نبوی ﷺ ہی کے مرہون منت ہیں۔ حالی اور اقبال کے اسی بنیادی نکتہ کی تفہیم ظفر علی خاں نے بھی کی۔ انھیں دانشورانہ سطح پر احساس تھا کہ ماحول کیا ہے؟ عصری ضرورتیں اور تقاضے کیا ہیں؟ اور کن سطحوں پر ان میں

تبدیلیوں کی ضرورت ہے؟ اور جب حالی اور اقبال کی طرح ان
کے پیش نظر یہ نکتہ آیا کہ سایۂ رسول ﷺ ہی میں عافیت ہے تو
انھوں نے ایک وسیع تناظر میں یہ سوچا کہ اگر ایک شخص کی عاقبت
اتباعِ نبوت ﷺ سے سنور سکتی ہے تو پوری قوم کی عاقبت اس
سے کیوں نہیں سنور سکتی؟ لہٰذا انھوں نے نعت کو شخصی پیرائے سے
نکال کر ملّی پیرائے میں پیش کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ریاض
مجید کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ ظفر علی خاں کی نعتوں میں
ملی عناصر کا کینوس حالی اور اقبال سے بھی زیادہ وسیع ہے۔،،

نعت گوئی کی تاریخ میں بعض اُمور میں مولانا کو خصوصی مقام حاصل ہے۔ انھوں نے حالی اور اقبال سے گہرا تاثر لیتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔ انھوں نے بہ طور صنفِ سخن نعت گوئی کو اپنایا اور اس کے ذریعے مسلمانوں کی زبوں حالی کو سہارا بھی دیا اور انھیں ایک روشن مستقبل کی راہ بھی دکھائی۔ اپنے دور کی سیاسی اور سماجی تلخیوں کو نعتیہ آہنگ دے کر، آلامِ روزگار کو آسان بنا دیا۔ یوں غمِ دوراں اور غمِ جاناں کا ایک حسین امتزاج ان کی نعت گوئی کی ایک خصوصیت بن گیا۔ انھوں نے قادیانی نبوت کا تار و پود بکھیر کر ختمِ نبوت کے تحفظ کو ایک ایسی تحریک بنا دیا جو میرزائیوں کو اقلیت قرار دینے پر منتج ہوئی۔ انھوں نے حالی ہی کے انداز میں کائنات اور ذات دونوں کے غم بہ طور استغاثہ حضور ﷺ کی بارگاہِ بندہ نواز میں پیش کیے۔ مگر ہر مقام پر حضور ﷺ کی ذاتِ اقدس کو وسیلہ اور حوالہ بنایا اور استعانت اُسی ذاتِ بلند و برتر سے چاہی جس کی ہم عبادت کرتے ہیں اور جو فی الواقع ہمارا نشیمن بھی ہے اور شاخِ نشیمن بھی۔ وہ ہر اڑے وقت میں نبیٔ کریم ﷺ سے التماس کرتے ہیں کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائیں کہ اُمتِ مسلمہ کی ظلمتیں نور کے سانچے میں ڈھل جائیں اور درد و غم کی کلفتیں،

راحتوں میں بدل جائیں۔ حقیقت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ کی دُعا کو اُمت کے لیے وجہِ سکون قرار دیا ہے۔ نیز مولانا نے سیرت کے درخشاں موتیوں اور قرآن و حدیث میں بکھری ہوئی صداقتوں سے اپنی نعت کو واقعیت کا حسن عطا کیا۔ بہ ہر کیف مولانا نے اپنی نعت کو ادیبانہ جمال، خطیبانہ جلال اور مؤرخانہ کمال دے کر ایک ایسی تحریک کی شکل دی جس نے مستقبل کو جذبہ وجنوں کا والہانہ پن بھی بخشا اور توانائی ورعنائی کا سرمایہ بھی۔ بہت سے نعت گو شعرا نے اپنی ذات کے حوالے سے نعتیں کہی ہیں۔ انھوں نے اِنھی مضامین کو نعت بنایا ہے جو ان کا دل حضور ﷺ کے بارے میں محسوس کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارا احساس محبت اور شیفتگی ہی کا حاصل ہے۔ بعض نے حضور ﷺ کی ذات بابرکات کے شمائل کو نعت میں ڈھالا اور یوں منظوم سراپا نگاری کو واقعیت کا تقدس ملا کہ عام محبوب کا ذکرِ جمال، مبالغے کی حدوں کو پھلانگ کر بھی حسنِ اظہار کے اُس کمال تک نہیں پہنچ سکا جو حضور ﷺ کے ظاہری سراپا کے واقعی اظہار کو نصیب ہے کہ آپ ﷺ فی الواقع حسنِ کائنات بھی تھے اور کائناتِ حسن بھی۔ بعض شعراء نے اُن تاریخی واقعات کو نظم کیا جن کا تعلق حُبِ رسول ﷺ کی سرشاریوں اور ناموسِ رسول ﷺ کی پاسداریوں سے تھا کہ محبّ کیسے جاں نذر کر کے بھی، اس تاسُّف کا شکار رہتا ہے کہ اس سے محبوب کے شایانِ شان کچھ بھی نہ ہو سکا۔ بعض سیرت کے مختلف پہلوؤں کو نظم کرتے ہیں کہ یہ سیرت ایک منارِ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ کچھ نعت گو ایسے بھی ہیں جو حضور ﷺ کو قرآن پاک کے آئینے میں دیکھتے اور قرآن ہی کی روشنی میں انھیں پیش کرتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنے ممدوحِ عظیم وجلیل کو اُسی رنگ و آہنگ سے نعت میں پیش کرنے کی سعی کی ہے جو قرآن کا نشانِ امتیاز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حضور ﷺ کو ایک آفاقی اور عالمی رہبر کی حیثیت سے پیش کیا ہے کہ حضور ﷺ ہمارے ہی نہیں، سب کے ہیں اور اُن کی اُمت،

جُملہ موجوداتِ عالم کی رہ نمائی کے لیے بھیجی گئی ہے۔نعت کا یہ رنگ سراسر قرآنی ہے۔ چند شعر دیکھیے:

وہ وقت آنے کو ہے جب ایشیا کی طرح یورپ بھی
رسول اللہ ﷺ کے خوانِ کرم سے ریزہ چیں ہو گا

عرب کے واسطے رحمت، عجم کے واسطے رحمت
وہ آیا، لیکن آیا، رحمۃ للعالمیں ہو کر

ہیں عرب و عجم ترے، دونوں پہ ہیں کرم ترے
تجھ سے حرم کی آبرو، تیرے قدم میں سومنات
سارے جہان کے لیے دیدۂ ہوش تو ہی تھا
ہم سے پھرا ہوا ہے کیوں گوشۂ چشمِ التفات

مسلّم ہے خدا کے بعد جس کی شانِ یکتائی
ہے نام اس کا محمد ﷺ ابن عبداللہ بطحائی
وہ آیا جس کی رحمت کی فراوانی کے دامن میں
جہانِ اسود و احمر نے یکساں پرورش پائی

اور آخری شعر اس بات کی دلیل ہے کہ ظفر علی خاں نعت میں حضور ﷺ کو پوری کائنات کے لیے منبعِ رُشد و ہدایت بنا کر پیش کرتے ہیں مگر وہ اپنی ذات کو پھر بھی نہیں بھولتے اور اپنی ذاتی فلاح و کامرانی کے لیے اُسی گوشۂ چشمِ التفات کے تمنائی ہیں جو ہر خشک و تر کے لیے رحمت ہے اور جس شخصیت کا ہر بول رحمت، ہدایت اور شفقت

سے معمور ہے۔

اب مولانا کی نعت سرائی کے متنوع پہلوؤں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔ اقبال نے کہا تھا ؎

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

ظفر علی خاں، حضور ﷺ کو وجہِ وجودِ کائنات ثابت کرنے کے لیے

لولاك لما خلقت الافلاك

والی حدیث کا سہارا لیتے ہیں جس کی اصل، محققین کے نزدیک محلِّ نظر ہے۔ مگر اس کے باوصف یہ ایک مسلّم حقیقت ہے کہ کائنات انسان کے لیے بنائی گئی۔ چاند تاروں کو ضیا انسان کے لیے دی گئی۔ اسی کے نظارے کے لیے شاخِ گل جھومتی ہے اور عروسانِ چمن کا یاسمینی بانکپن اسی ظلوماً جھولاً کے لیے ہے۔ ابوالبشر۔ اسی کائنات کو سجانے کے لیے اترے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ یہ ساری آرائش ایک خیر البشر ﷺ کے لیے ہے جو اپنے نورِ وجود کے اعتبار سے اولین اور ظہورِ وجود کے لحاظ سے آخرین ہے۔ کیونکہ کوئی بھی اول ہوئے بغیر آخری نہیں ہوسکتا۔ اسی لیے ظفر علی خاں حضور ﷺ کو ہر غایت کی غایت اول، نورِ صبح اولین کو انھی کے انوار کا پرتو، ان ﷺ کے ذکر کو محفلِ حیات کی رعنائی، انھی کی رعنائی کو کائنات کے چہرے کا غازہ اور انھی کے جمال کو ہر ارضی حُسن اور ہر سماوی تجلّی کا امین قرار دیتے ہیں ؎

گر ارض و سما کی محفل میں لولاکِ لما کا شور نہ ہو
یہ رنگ نہ ہو گلزاروں میں، یہ نور نہ ہو سیاروں میں

فقط دو حقائق پہ دنیا ہے قائم
بقائے خدا و دوام محمد ﷺ

سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تمھی تو ہو

خدا نے اس کو اپنے حسن کے سانچے میں ڈھالا ہے
چھنا ہے اس کا پر تو، نورِ صبحِ اولیں ہو کر
خدا کی شان سے رونق ہے موجوداتِ عالم کی
وہ سب نبیوں کے بعد آیا مگر کیا کیا نہیں ہو کر

اے کہ ترا شہود ہے وجہِ نمودِ کائنات
اے کہ ترا فسانہ ہے زینتِ محفلِ حیات
اے کہ ہیں تیری ذات میں جمع زمانہ کے صفات
سب ملکی تصرفات، سب فلکی تجلیات
اے کہ تری نمود ہے غازۂ روئے کائنات
جلوہ فشاں ہیں ہر طرف تیری ہی سب تجلیات
نور ترا نہ چیرتا گر افقِ شہود کو
ختم نہ ہوتی آج تک تیرگئ شبِ حیات

چمن پیرائے امکاں گر نہ ذاتِ مصطفیٰ ﷺ ہوتی
مشامِ جاں معنبر ہو نہ سکتا کوئے عرفاں سے

دنیا میں رحمتِ دوجہاں اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھی تو ہو

وہ اُٹھا خاکِ بطحا سے سعادت کا امیں ہو کر
علم بردارِ حق بن کر، سپہ سالارِ دیں ہو کر

ختم تجھ پر ہو گیا انسانِ کامل کا لقب
لا نہیں سکتے زمین و آسماں تیرا عدیل

خدا سے واصل اور دنیا میں شامل
رسول اللہ ﷺ ہیں انسانِ کامل

ڈال رکھی ہے گلیمِ فقر اس نے دوش پر
اس کے سر پر ساتھ ہی تاج جہانبانی بھی ہے
وہ خدا سے دور بھی ہے اور خدا کے پاس بھی
وہ رسول اللہ ﷺ بھی ہے اور ظلِّ سبحانی بھی ہے

وہ جب آیا تو ساتھ اس کے اک ایسا انقلاب آیا
کہ ہیں اس وقت تک مہر و مہ و انجم تماشائی
وہ ساقی جس کی محفل کے لیے دوشِ ملائک پر
خمستانِ ازل سے مے سبو میں سربہ مہر آئی
وہ آقا جس کی رحمت کی فراوانی کے دامن میں
جہانِ اسود و احمر نے یکساں پرورش پائی
وہ مولیٰ جس کے لطفِ بے نہایت کا یہ عالم ہے
کہ تنگ اس کے لیے تھی مشرق و مغرب کی پہنائی

مولانا ظفرعلی خاں نے اپنی نعت گوئی میں زیادہ زور سیرت رسول ﷺ پر دیا ہے کہ یہ سیرت ہر دور کے ہر انسان کے لیے زندگی کے ہر مرحلے میں سرمایۂ بصیرت ہے۔ مولانا نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ چونکہ آپ ﷺ پر رسالت ختم ہے اس لیے آپ ﷺ کی رہنمائی تا ابد ہر دور کو محیط ہے۔ حضور ﷺ نے دینی اور دنیاوی معاملات میں اعتدال کا حسن پیدا کیا اور یہ آپ ﷺ ہی کا شعارِ حسیں ہے کہ بات، حق کہی جائے خواہ نتیجہ دارورسن ہی کیوں نہ ہو۔ ظفرعلی خاں سیرتِ رسول ﷺ کے اس خوب صورت پہلو کو بھی ابھارتے ہیں جس میں حضور ﷺ اپنے جانی دشمنوں کے لیے عافیت کی دُعا فرماتے ہیں اور راستے میں کانٹے بکھیر نے والوں کو بھی پھولوں میں تولتے چلے جاتے ہیں۔ ظفرعلی خاں کے نزدیک ہمارے جرم ہائے سیاہ کو بالآخر اماں ملے گی تو اُسی شفیع المذنبیں ﷺ کے دامنِ کرم میں، جس نے بروں کے بارے میں یہ فرمایا کہ وہ میرے ہیں۔ عظمت، لالہ وگل کی محبت سے کہیں زیادہ کانٹوں کو سینے سے لگا لینے میں ہے، لالہ وگل کو تو ہر دل قبول کرتا اور ہر آنکھ بہ نظرِ تحسین دیکھتی ہے ۔

وہ شمع اُجالا جس نے کیا چالیس برس تک غاروں میں
اک روز جھلکنے والی تھی سب دُنیا کے درباروں میں
جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا جو نکتہ وروں سے کھل نہ سکا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

بن گیا قرآں کی ہر ہر سطر ہر ہر لفظ میں
نطق تیرا شانۂ زلفِ پیامِ جبرئیل
تیری روشن زندگی کے کارنامے بن گئے
اہلِ ایماں کے لیے ہر مرحلہ میں سنگِ میل
کر دیا تو نے قوامِ دین و دنیا معتدل
ناخنِ رہبانیت کی جڑ میں ٹھونکی تو نے کیل

اے شہ ہر دو جہاں، سرورِ کون و مکاں ﷺ
تو ہے خدا کا حبیب، تو ہے خدا کا ندیم
تو ہے شفیع تو ہے نبیٔ کریم ﷺ
تو ہے قسیمِ جسیم، تو ہے نسیمِ وسیم
تجھ سے مزین ہوئی مسندِ پیغمبری
تجھ سے فروزاں ہوئی بزمِ الف لام میم
دیکھ کر تجھ کو گرے لات و ہبل سر کے بل
آتے ہی تیرے فرو ہو گئی نارِ جحیم

کون سی ایسی ہوئی اس میں تعجب کی بات
تیرے اشارے سے ہو گر مہِ کامل دو نیم

کسریٰ کا تاج روندنے کو پاؤں کے تلے
اور بوریا کھجور کا گھر میں بچھا ہو ا
دستِ دُعا انھی کے لیے عرش تک بلند
ہے جن کی آستین میں خنجر چھپا ہوا
بوتے رہے جو رستہ میں کانٹے تمام عمر
پھولوں میں ایک ایک ہے آکر ٹلا ہوا
احسان کی نوید سپید و سیاہ کو
سب کے لیے دریچۂ رحمت کھلا ہوا

اُس نبی ﷺ کا تھام لے دامن جو ہے ختمِ رسل
جس کی رحمت ہے دو عالم کی سعادت کا نچوڑ
چشمۂ دینِ محمد ﷺ خشک ہو سکتا نہیں
اس کنوئیں سے آکے پانی بھر جو ہے پاتال توڑ

وہ آقا ﷺ جس کی رحمت نے اگر اپنوں کو ڈھانپا ہے
تو اوقاتِ مصیبت میں پرایوں کے بھی کام آیا

واقعۂ معراج کے بارے میں علامہ اقبال کے دو شعر ہیں ۔

اخترِ شام سے آتی ہے فلک سے آواز
سجدہ کرتی ہے سحر جس کو وہ ہے آج کی رات
رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلمان سے معراج کی رات

مولانا ظفر علی خاں اور علامہ اقبال میں پرخلوص دوستانہ روابط تھے۔ دونوں مل کر شعر بھی کہا کرتے تھے اور خانگی نوعیت کے بعض واقعات کو بھی نظم کر دیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ علامہ اقبال، مولانا کے دفتر میں آ کر اُن سے نعتیں سن کر شاد کام ہوا کرتے تھے۔ گو دونوں کے فکر کی منزل ایک تھی مگر اقبال کے حکیمانہ افکار کی دُنیا کہیں وسیع تھی اور ظفر علی خاں کے رشحاتِ خامہ کا عالم، سیاست وصحافت کی ہنگامی ضروریات تک محدود۔ مگر مولانا کی نعت گوئی اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ ایک ایسا نغمہ ہے جس پر نہ کوئی موسم کی قید ہے نہ کسی وقت کی پابندی۔ اس لیے اس نغمے کی خوش الحانی نہ فصلِ لالہ وگل کی محتاج ہے اور نہ خزاں کی ویرانی اسے افسردہ کر سکتی ہے۔ یہ الگ بات کہ یہ نغمہ ہر ساز پر نہیں گایا جا سکتا۔ اس کے لیے خاص دل مخصوص ہوتے ہیں۔ ممکن ہے علامہ اقبال ہی کے تتبع میں، ظفر علی خاں نے بھی واقعۂ معراج پر طبع آزمائی کی ہو۔ اُن کی ایک طویل نعت اسی رنگ میں ہے۔ گو علامہ چند شعر ہی کہہ سکے کہ بہ قول ایک نقاد وہ سو بار سوچتے اور ایک بار لکھتے تھے۔ جب کہ ظفر علی خاں کی طبیعت میں روانی اور طغیانی تھی۔ طبعِ رسا کھلتی تھی تو کھلتی ہی چلی جاتی تھی۔ قلم حرکت میں آتا تھا تو روکے نہیں رُکتا تھا۔ واقعۂ معراج کے بارے میں مولانا کے خامۂ عنبر شمامہ کی اڑانیں دیکھیے۔ ایک طرف جبرئیل حضور ﷺ کو لے جا رہے ہیں اور دوسری طرف اُن کا قلم اُس مقامِ ارفع واعلیٰ کی حقیقتوں کو کھولتا چلا جا رہا ہے جہاں عقل کے پَر جلتے اور محبت کا والہانہ پن باریابی پاتا ہے ؎

جلتے ہیں جبرئیل کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھی تو ہو
جو ماسوا کی حد سے بھی آگے گزر گیا
اے رہ نوردِ جادۂ اسریٰ تمھی تو ہو

عشق مہمان ہوا حسن کے گھر آج کی رات
جذبۂ دل ہے بہ آغوشِ اثر آج کی رات
بختِ بیدار نے دی دولتِ سرمد کی نوید
کیوں نہ آنکھوں میں کٹے تا بہ سحر آج کی رات
اپنے اللہ سے ملنے کے لیے جاتا ہے
اپنے اللہ کا منظورِ نظر آج کی رات
ماہ و انجم نے سر راہ بچھا دیں آنکھیں
کیوں کہ ہے ناقۂ اسریٰ کا سفر آج کی رات
کہکشاں جلوہ فشاں ہے کہ اسی رستے سے
ہونے والا ہے محمد ﷺ کا گزر آج کی رات
چاند کیا چیز ہے، سورج کی حقیقت کیا ہے
پرتوِ نور سے روشن ہے نظر آج کی رات
اُٹھ گیا چہرۂ ہستی سے نقابِ اسرار
لائی ہے رازِ امانت کی خبر آج کی رات
مل گئی دونوں جہانوں کے خزانوں کی کلید
اپنے معراج پہ پہنچا ہے بشر آج کی رات

لائے براق جبرئیل کس لیے اس کے واسطے
ہوتی تھی جس کی رات دن گنبدِ عرش پر نماز

سواری رہِ نوردِ منزلِ اسریٰ کی جب نکلی
تو جبریلِ امیں تھامے ہوئے اس کی لگام آیا

شبِ معراج وہ شب ہے کہ کھولے ربِّ اکبر نے
رسول اللہ ﷺ پر اسرارِ خلوت گاہ او ادنیٰ
یہ وہ شب ہے کہ پیغمبر ﷺ کے سر پر اپنے ہاتھوں سے
خدا نے فخر سے رکھا ہے تاجِ سطوتِ کبریٰ
یہ وہ شب ہے کہ روشن کر دیئے چودہ طبق اس نے
تجلی بن گئی اس کی فروغِ دیدۂ بینا
یہ وہ شب ہے کہ اس کی روشنی سے جگمگا اُٹھے
در و بام و رواق و طاقِ قصرِ ملتِ بیضا
غبارِ راہ کیا تھا، کہکشاں کی جلوہ ریزی تھی
گلی کوچوں پہ ہوتا تھا گمانِ سینۂ سینا

آخری شعر کے ساتھ ہی علامہ اقبال کا یہ شعر حاشیۂ خیال پر خود بہ خود ابھر آتا ہے

؎ وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

صحابہ کرامؓ کا ذکر پُر نور بھی ہر دور کی نعت کا ایک قابلِ ذکر پہلو رہا ہے کیوں کہ وہ نفوسِ قدسیہ، بہ راہِ راست انوارِ نبوت سے فیض یاب تھے۔ اُن کی نگاہیں رُخِ رسالت

مآب ﷺ سے بہ راہِ راست انوار سمیٹتی تھیں، اُن کے دل کی دھڑکن حضور ﷺ کی آوازِ پا سے ہم آہنگ رہتی تھی اور اُن کی ہر طلب خوانِ رسالت ﷺ کی خوشہ چینی اور اُن کا ہر عمل اسوۂ رسالت ﷺ سے پُر انوار تھا۔ اسی لیے ہر صحابیؓ روشن ستارہ ہے کہ اس سے دل لگا کر دل کی ہر ظلمت، نور بن سکتی ہے۔ صحابہ کرامؓ سے محبت، خوشنودیٔ رسول ﷺ کا باعث ہے کہ وہ سب ایک ہی مشعل کی کرنیں ہیں اور یہ انھی کی والہانہ جاں فروشیوں اور پرخلوص کاوشوں کا اثر ہے کہ اس خطۂ ارض کا کوئی گوشہ اور اوقاتِ عالم کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جو نبیِ کریم ﷺ کے ذکرِ حسین سے منور و معنبر نہیں ہے۔

ظفر علی خاں نعت میں جا بہ جا ان پاک ہستیوں کے حضور میں خراجِ عقیدت پیش کرتے چلے جاتے ہیں ؎

اسلام کا زمانہ میں سکہ بٹھا دیا
اپنی مثال آپ ہیں یارانؓ مصطفیٰ ﷺ

کٹ مرنے کو ناموسِ نبی ﷺ پر ہوں میں تیار
وہ سر جو ہوا تن سے جدا میرے لیے ہے
ترکہ میں ملی ہے مجھے فاروقؓ کی سطوت
صدیقؓ کا اندازِ صفا میرے لیے ہے
جس قوتِ بازو نے اکھاڑا درِ خیبر
وہ موہبتِ شیرِ خداؓ میرے لیے ہے
میں مٹ کے رہِ حق میں ہوا زندۂ جاوید
خوش ہوں کہ فنا میں بھی بقا میرے لیے ہے

صدیقؓ ہوئے تصدیق میں ہم، فاروقؓ بنے تفریق میں ہم
ایماں طلبی میں بوذرؓ ہیں، خیبر شکنی میں صفدرؓ ہیں
ہیں جانِ حیا عثماںؓ کی طرح، ہیں آنِ وفا سلماںؓ کی طرح
اسلام ہے کف، ہم خنجر ہیں، طاغوت ہے رگ، ہم نشتر ہیں

سیل کی طرح جو نکلے تھے بیابانوں سے
آبِ جُو بن گئے، گزرے جو خیابانوں سے

آخری شعر قرآن پاک سے بہ راہِ راست ماخوذ ہے۔ اس مفہوم کے اشعار علامہ اقبال کے بھی ہیں کہ مسلمان اپنوں کے لیے ریشم ہے اور دشمنوں کے مقابلے میں فولاد۔

دل کی ساری داستان آرزو ہی سے رنگین ورعنا ہے۔ آرزو بکھر جائے تو سینوں کے اندر دل مرجھا جاتے ہیں اور انسان بصارت کے باوجود بصیرت سے محروم رہتا ہے۔ ضمیرِ لالہ میں چراغِ آرزو روشن ہو تو پورا ماحول منور اور معطر ہو جاتا ہے۔ ہر آرزو، کسی نہ کسی مقصود، محبوب اور مطلوب کے گرد گھومتی ہے۔ مولانا ظفر علی خاں اپنی نگاہوں کی جملہ تمناؤں اور اپنے دل کی جملہ چاہتوں میں، حضور ﷺ ہی کے واسطے سے، یوں رنگ بھرتے ہیں کہ جہاں تک نگاہ جاتی ہے، چراغ ہی چراغ جگمگاتے ہیں اور جہاں تک خیال جاتا ہے، روشنی ہی روشنی نظر آتی ہے۔ آرزو جواں ہو تو زندگی بھی جواں ہے ورنہ زندگی اپنے ہر ادعا کے باوجود مرگِ ناگہاں ہے۔ ظفر علی خاں کہتے ہیں۔

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دُنیا تمھی تو ہو

سارے جہاں کی حکمتیں تیرے کلام پر نثار
سارے جہاں کی دولتیں تیرے نظام پر نثار
ہم تری ذات پر فدا ہم ترے نام پر نثار
تیری گلی میں ہوں مقیم، تیرے مقام پر نثار

تیری چشمِ مست کا صدیقِ اکبرؓ ہے خراب
تیری تیغِ ناز کا فاروقِ اعظمؓ ہے قتیل

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ طیبہ کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

مجھ کو رسول اللہ ﷺ کی الفت، لطفِ خدا سے مل ہی گئی
اے دلِ ناداں، اس سے زیادہ تجھ کو ہو کس دولت کا حصول
دین بھی ہو جائے مجھے حاصل، دنیا کی بھی مراد ملے
گوشۂ چشمِ عنایت مجھ پر ہو جو پیمبر ﷺ کا مبذول
آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھوں دولتِ مشرق و مغرب کو
سرورِ عالم ﷺ اگر فرما لیں نذرِ محقر مری قبول

رسول اللہ ﷺ کے فیوض و برکات کا سلسلہ ایک دوامی وسعت کا حامل ہے۔ آپ ﷺ ہر نوع سے بشیر ہیں۔ نذارت بھی ایک نوع سے بشارت ہے کہ اس سے گمراہوں کو راستے کی وہ صداقت نصیب ہوتی ہے جو انھیں جنت تک لے جاتی ہے۔ آپ ﷺ عالمین کے لیے رحمت ہیں، آپ ﷺ اپنی اُمت کے لیے حریص ہونے کی